

اشارات

صحیح سمتِ سفر

آزاد خارجہ پالیسی، معاشی خود انحصاری

پروفیسر خورشید احمد

جنرل پرویز مشرف کی سول، ملٹری حکومت ابتدائی تشکیلی مراحل سے گزر کر اب کچھ واضح شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ چیف ایگزیکٹو نے ملک اور ملک کے باہر متعدد پالیسی بیانات کے ذریعے اپنے مقاصد اور اہداف کو ایک حد تک متعین شکل میں پیش کر دیا ہے۔ نیز مرکز اور صوبوں میں نئی حکومت کے چہرے کے خدوخال بھی خاصی حد تک نمایاں ہو گئے ہیں۔ جلد بازی میں دیے گئے چند بیانات اور اقدامات کی بھی کسی نہ کسی درجہ میں توضیح اور تصحیح کی کوشش کی گئی ہے اور اب سرکاری موقف نسبتاً زیادہ احتیاط اور اعتماد سے پیش کیا جانے لگا ہے۔

اختیارات کے حصول کو چاہے ابھی چند ہفتے ہی ہوئے ہوں لیکن نئی قیادت میں اس کانٹوں سے بھری راہ کا کچھ نہ کچھ بہتر شعور پیدا ہونا بھی ایک فطری توقع ہے۔ پریس کی آزادی اور سیاسی سرگرمیوں کے مواقع نئے انتظام کو غلط راہوں پر بھٹکنے سے روکنے میں اور غیر ضروری تجربات کرنے سے بچانے میں بڑا اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ بین الاقوامی دباؤ نہ صرف یہ کہ موجود ہے بلکہ ایک حد تک گھمبیر ہوتا جا رہا ہے اور اس بات کی ضرورت اور بھی بڑھ گئی ہے کہ قومی سطح پر کھلی بحث و گفتگو کے ذریعے ملک اور اس کی قیادت کو قومی مقاصد کے حصول کے راستے پر قائم رہنے اور چلنے کے لیے مشورے، رہنمائی اور احتساب کے عمل کو زندہ رکھا جائے، تاکہ نئی ٹیم تجربے کی کمی یا بیرونی دباؤ کے تحت کوئی غلط اقدام نہ کر ڈالے۔

جنرل پرویز مشرف اور ان کی ٹیم کو اصلاح احوال کا ایک نادر موقع ملا ہے۔ قوم نے بحیثیت مجموعی ۱۳ اکتوبر کے اقدام کا خیر مقدم کیا ہے اور بیرونی قوتوں کی آتش نوائی اور روایتی مراکز قوت کی سردمہری کے

باوجود ملک کے عوام، بیرون ملک پاکستانیوں اور بڑی حد تک دنیا بھر کے مسلمان عوام نے نئی قیادت کے لیے کلمہ خیر کہا ہے۔ اس کی بڑی وجہ ایک تو پچھلی حکومتوں کی مجرمانہ کارگزاریاں اور ناقابل معافی ناکامیاں ہیں تو دوسری طرف فوج کے بارے میں حسن ظن اور چیف ایگزیکٹو کے بیانات میں ان مسائل اور اہداف کا اعلان و اظہار ہے جو دراصل اس وقت پاکستانی قوم کا بالخصوص اور امت مسلمہ کا بالعموم حقیقی ایجنڈا ہیں۔ نیز جس اخلاقی اور سیاسی اعتبار سے گھنٹاؤں نے کھیلنے فوجی قیادت کو ۱۲ اکتوبر کو فوری اقدام کے لیے مجبور کیا وہ بھی رائے عامہ کو اس کے حق میں استوار کرنے کا سبب بنا ہے۔

ان تمام عوامل نے مل کر نئی قیادت کے لیے گھر کو سنوارنے، عوام کے دکھوں کا مداوا کرنے اور ملت اسلامیہ پاکستان کے تاریخی عزم کو بروئے کار لانے کے لیے بڑا سازگار ماحول پیدا کر دیا ہے۔ یہ ایک ایسا ہی موقع ہے جیسا ۱۹۴۷ء میں حصول آزادی کے بعد بڑے خوش کوار ماحول میں اور ۱۹۷۲ء میں مشرقی پاکستان کھو دینے اور بھارت سے شکست کھانے کے بعد بڑے ناخوش گوار حالات میں تعمیر نو کے لیے اس وقت کی قیادت کو حاصل ہوا تھا۔ بد قسمتی سے قائد اعظم کی وفات اور مسلم لیگ کی قیادت پر مفاد پرست سول، ملٹری اور سیاسی عناصر کے قبضے نے اولین دور میں، اور جناب ذوالفقار علی بھٹو کی ہوس اقتدار اور بیرونی نظریات سے عشق نے دوسرے دور میں اصلاح اور تشکیل جدید کے تمام امکانات کو معدوم کر دیا۔ آج پھر قوم ماضی کی سول اور ملٹری حکومتوں سے مایوس ہو کر مایوسی، گھٹن اور انتشار کا شکار ہو چکی تھی کہ حالات نے ایک ایسی کروٹ لی جس نے فوجی قیادت کو میدان میں قدم رکھنے پر مجبور کر دیا۔ ہم سمجھتے ہیں اگر نئی قیادت وقت کے تقاضوں اور قوم کی اصل امنگوں اور ضرورتوں کا صحیح ادراک کر لیتی ہے تو ملک کی گاڑی کو کامیابی کے ساتھ پیٹری پر ڈالا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ متصد نہ آپ سے آپ حاصل ہو سکتا ہے اور نہ اس منزل کی طرف پیش قدمی ذہنی تحفظات، بے اعتمادی، عدم مشاورت اور بیرونی دباؤ کے تحت ممکن ہے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پوری دیانت داری کے ساتھ اور الدین نصیحة (دین نام ہی خیر خواہی اور صحیح مشورے کا ہے) کے اسلامی حکم کے جذبے کے تحت چند باتیں قوم اور اس کی قیادت کے سامنے واضح طور پر رکھ دی جائیں۔۔۔ وما علینا الا البلاغ۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مسلمان کی قوت کا اصل سرچشمہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے دین اور امت مسلمہ سے وفاداری کا تعلق ہے۔ اقبال نے ہماری پوری تاریخ کو ایک جملہ میں بیان کر دیا ہے: ”میں نے اپنی تاریخ کے مطالعہ سے ایک ہی سبق سیکھا ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں نے اسلام کا تحفظ نہیں کیا، یہ اسلام ہے جس نے مسلمانوں کو ہمیشہ بچایا اور محفوظ و مامون رکھا ہے۔“

اس وقت ملک پر اور خصوصیت سے نئی قیادت پر تین بڑے بڑے دباؤ (pressures) ہیں۔ ایک

بین الاقوامی سیاسی دباؤ جو امریکہ کے عالمی عزائم اور منصوبوں کا حصہ ہے۔ وہ پاکستان کو ایک ایسی قوت سے آراستہ مضبوط اسلامی ملک کی حیثیت سے ابھرتا دیکھنا نہیں چاہتا۔ دوسرا معاشی دباؤ جو ماضی کی معاشی پالیسیوں کا نتیجہ ہے مگر جس نے بیرونی دباؤ کے مقابلے میں ملک کی قوت برداشت کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ اور تیسرے ملک کے اندر وہ اقلیتی مگر بہت متحرک اور فعال لابی (lobbies) جو عوام کے ایمان، جذبات اور عزائم کے مقابلے میں محدود سیکولر اہداف یا عالمی ایجنسیوں کے لیے کام کر رہی ہیں۔ جو خود ملک کی فوج کو بھی ایک مضبوط جمادی قوت نہیں دیکھنا چاہتیں بلکہ طرح طرح سے ایسے راستے دکھاتی ہیں کہ فوج ایسا تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ کے مونٹو (motto) سے ہٹ جائے اور فوج اور عوام میں یک رنگی و ہم آہنگی باقی نہ رہے۔

ان تینوں رجحانات کا صحیح ادراک اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری یکسوئی کے ساتھ اللہ پر بھروسہ، دین حق سے وابستگی اور وفاداری اور مسلمان عوام کی طاقت کو منظم اور متحرک کرنا وقت کی ضرورت ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ نئی قیادت نے صاف الفاظ میں یہ اعلان کر دیا ہے کہ قرارداد مقاصد قومی سلامتی کا اصل محور اور مرکز ہے۔ پالیسی سازی کے لیے قرآن و سنت سرچشمہ ہدایت ہوں گے اور پاکستان کی منزل اور ہدف کا وہ تصور ہو گا جو علامہ اقبال اور قائد اعظم نے پیش کیا تھا اور جس پر پاک و ہند کے مسلمانوں نے تحریک پاکستان کی حمایت کی تھی۔ یہی آج بھی پاکستان کے مسلمانوں کی اصل منزل اور ان کی امیدوں کا مرکز ہے۔ اس بارے میں مکمل یکسوئی ہونی چاہیے اور ہر نوع کی ٹولیدہ فکری، تضاد بیانی اور ذہنی تحفظات کا دروازہ بند ہونا چاہیے۔ اسلام کے دائرے میں بے پناہ آزادی فکر و عمل ہے اور اسلام بہترین شوریٰ اور فلاحی نظام کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ مسلم امت کو نہ کسی دوسرے نظام اور نظریے کی ضرورت ہے اور نہ یہاں کوئی اور کلمہ چل سکتا ہے۔ اس پہلو سے نئی بحثیں شروع کرنا، فتنہ و فساد کا ذریعہ بن سکتا ہے جو بہت نقصان کا سودا ہو گا۔ اس لیے بحث کا یہ باب بند ہونا چاہیے اور ساری توجہ اسلام کے اصولوں کے مطابق اور اقبال اور قائد اعظم کے قوم سے عہد و پیمان کی روشنی میں صحت مند پالیسیوں کی تشکیل اور ان پر خلوص اور محنت سے عمل پر مرکوز ہونی چاہیے۔

اقبال نے بہت واضح انداز میں کہا تھا کہ:

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمران ہے اک وہی باقی بتان آذری

اور یہ کہ

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
وہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کر دے

اور

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلمان
اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار

۱۹۳۷ء میں قائد اعظم کے نام اپنے خط میں انھوں نے لکھا تھا:

اسلامی قوانین کے گہرے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اس قانون کو اچھی طرح سمجھا جائے اور اس پر عمل کیا جائے تو کم از کم ہر شخص کے لیے روزی کا حق محفوظ ہو جاتا ہے لیکن اس ملک میں جب تک ایک مسلم ریاست کا قیام نہ ہو، اسلامی شریعت کا نفاذ ممکن نہیں۔

قائد اعظم نے بھی صاف لفظوں میں کہا تھا: ”پاکستان کا قیام، منزل نہیں ایک ذریعہ ہے۔۔۔ اصل منزل اسلامی نظریہ ہے۔“ قائد اعظم کے ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۸ء تک ایک نہیں تقریباً دو سو بیانات موجود ہیں جن میں اس منزل کی واضح نشان دہی کی گئی ہے۔ جناب شریف الدین پیرزادہ نے اپنے ایک انٹرویو میں اس سلسلے کے سارے اعتراضات اور شبہات کا مدلل جواب دیا ہے اور صاف کہا ہے کہ قائد اعظم آخری لمحے تک اس موقف پر قائم تھے کہ پاکستان کی تعمیر اسلامی اصولوں کی روشنی میں ہونی چاہیے اور یہ کہ پاکستان کو اسلامی دنیا کے لیے ہی نہیں، پوری تیسری دنیا کے لیے نمونہ ہونا چاہیے اور یہ نمونہ جس ماڈل پر قائم ہو گا، وہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طرز حکومت ہے۔ حتیٰ کہ مصطفیٰ کمال کے سلسلے میں بھی قائد اعظم نے ایک ترک و فذ کے سامنے خود مصطفیٰ کمال کا بیان پیش کیا تھا کہ ترکی پہلی جنگ عظیم کے بعد اپنی کمزوری کی وجہ سے سیکولرزم قبول کرنے پر مجبور ہوا تھا اور فلسطین میں اسرائیلی ریاست کے قیام کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی موت سے کچھ ہی قبل مصطفیٰ کمال نے کہا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو وہ خود صلاح الدین ایوبی کی طرح اس کے خلاف جنگ کریں گے (شریف الدین پیرزادہ کا انٹرویو امپیکٹ انٹرنیشنل، لندن، اگست

(۱۹۹۵)

دوسری بنیادی بات یہ ہے کہ اللہ کے بھروسے اور اسلام سے قوت حاصل کرنے کے ساتھ ہماری دوسری ترجیح عوام کا اعتماد، ان کے جذبات و احساسات کا پاس، ان کے مسائل اور مشکلات کے حل کی فکر، ان کے عزائم اور تہمتوں کا احترام اور انھیں منظم و متحرک کرنا ہونی چاہیے۔ یہ ملک ۱۴ کروڑ مسلمانوں کا ملک ہے، چند باحیثیت جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور بیوروکریٹس کا نہیں۔ اگر خدا کی خوش نودی کے بعد اور اس کے تحت کسی اور کی خوشنودی مطلوب ہے تو وہ عوام کی ہے۔ بااثر طبقات یا بیرونی طاقتوں کی نہیں۔ اس وقت فوج کی وحدت اور امت پاکستان کی وحدت اور ان دونوں کے درمیان مکمل ہم آہنگی و نیاوادی اعتبار سے ہماری قوت کا سب سے اہم سرچشمہ ہے۔ دونوں کے اتحاد اور ہم آہنگی کو قائم رکھنے ہی

میں ملکی ترقی اور ملی استحکام کا راز پوشیدہ ہے۔ مخالفین کی کوشش ہوگی کہ عوام کے درمیان اختلافات رونما ہوں، فوج میں بھی دراڑیں پڑیں، اور فوج اور عوام کے درمیان ہم آہنگی اور یک رنگی ختم ہو۔ ہمیں ڈر ہے کہ حکومت کے نا تجربہ کار افراد بھی اس سلسلے میں ایسی غلطیاں کر سکتے ہیں کہ نئی قیادت اس جال میں پھنس جائے۔ اس لیے ہم بروقت متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ عوام کا اعتماد اور عوام اور فوج کی ہم آہنگی ضروری ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب عوام پر اعتماد کیا جائے، انھیں مشورے میں شریک کیا جائے، ان کی مشکلات، مسائل اور جذبات اور احساسات کو سمجھا جائے، ان سے ربط رکھا جائے۔ خود اپنی قوم سے ربط، اپنے عوام کے دل میں اتر کر ان کو سمجھنا اور ان کو ساتھ لے کر چلنا، بیرونی دوروں سے کہیں زیادہ ضروری ہے۔ دورے کافی ہو چکے اور اگر بہت ہی ضروری ہو تو کم سے کم وقت صرف کر کے اہم ممالک (مثلاً چین اور ایران) کا دورہ کر لیا جائے، لیکن اصل میدان پاکستان ہے، اصل قوت پاکستانی عوام ہیں، اصل کامیابی ان کی خوش نودی، تائید اور خدمت ہے۔ ترجیحات میں یہ تبدیلی وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

عوام کی تائید و تعاون کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ چند چیزوں کا مکمل احترام کیا جائے یعنی:

- ۱- اسلام اور قومی اہداف کے بارے میں کوئی غیر ضروری بحث نہ شروع کی جائے۔ اصل ضرورت اسلام پر بحث کی نہیں، عمل کی ہے۔ اس طرف قدم اٹھائیں۔
- ۲- احتساب کے عمل کو بے لاگ اور شفاف ہونا چاہیے اور کسی کے ساتھ بھی نا انصافی نہیں ہونی چاہیے، لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ ان تمام عناصر کو خواہ وہ کتنے ہی مضبوط اور چالاک کیوں نہ ہوں، جو ملک کو لوٹنے اور اس کی بنیادیں کھوکھلی کرنے کے ذمہ دار ہیں، کم سے کم وقت میں کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ یہ عوام کے دل کی آواز ہے۔

- ۳- ملک میں ظلم، نا انصافی، لاقانونیت، لوٹ کھسوٹ اور حق تلفی کا ایک ظالمانہ شیطانی نظام اوپر سے نیچے تک قائم ہو چکا ہے، اسے بڑی حکمت کے ساتھ اور بزور طاقت ہی ختم کیا جاسکتا ہے۔ تمام قوت اداروں کو مضبوط کرنے اور تمام افراد کو قانون کے تابع بنانے میں لگائی جائے اور جو اب دہی، کھلی حکمرانی اور خدمت کے کلچر کو عام کرنا چاہیے۔ اس کی مثال اوپر سے قائم ہو لیکن اسے ہر سطح پر بروئے کار لانا چاہیے۔ اس سلسلے میں آغاز کی ضرورت ہے، پھر یہ عمل خود آگے بڑھے گا، لیکن بارش کا پہلا قطرہ جلد برسنا چاہیے، تب ہی جس کی یہ فضا ختم ہو سکے گی۔

- ۴- عوام کے حقوق، پریس اور الیکٹرانک میڈیا کی آزادی، نیچے کی سطح تک اختیارات کی نیچے کی سطحوں کی طرف جلد منتقلی اور تعلیم، خوراک، صحت کی سہولتوں کے انتظام کی طرف توجہ دی جائے اور پوری انتظامی مشینری کو ان خدمات کی فراہمی کے لیے سرگرم عمل کیا جائے تاکہ

لوگوں کو فرق نظر آسکے۔

۵۔ معیشت کی اصلاح کے لیے دل کڑا کر کے ایک بنیادی تبدیلی کا فیصلہ کر لیا جائے اور وہ ہے خود انحصاری۔ اس سلسلے میں زبانی کلامی تو بہت کچھ ہوا ہے مگر ۱۹۵۵ء سے آج تک ساری پالیسی سازی کا رخ بیرونی امداد، قرضوں اور سرمائے کے حصول کی طرف رہا ہے جس نے ہماری معیشت محکومی کے ایک نظام جبر میں جکڑ دیا ہے۔ اس زنجیر بد (vicious circle) کو ٹوٹنا چاہیے۔ یہ کام جادو کی چھڑی سے نہیں ہو سکتا۔

۶۔ نظام انتخاب کی اصلاح اور دستور کی دفعہ ۶۲، ۶۳ پر عمل کے لیے مناسب نظام کار کی تیاری اور اس کے مطابق نئے انتخابات کا انعقاد۔

یہ وہ کم سے کم اقدامات ہیں جو عوام کے اعتماد کے حصول اور ان کو نظام حکمرانی میں شریک کرنے اور موثر قوت بنانے کے لیے ضروری ہیں۔ ہم یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ موجودہ حکمرانوں کو دستور میں کسی ترمیم کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔ اسی دستور کے تحت سارے کام ہو سکتے ہیں۔ اگر کسی دستوری ترمیم کی ضرورت ہے بھی، تو اسے عوام ہی دستوری ترمیم کے طریقے کے مطابق، مستقبل کے انتخابات کے بعد کریں۔ اس سے پہلے دستور میں ترمیم یا دستور کی تشکیل جدید کا دروازہ کھولنا بڑے فتنے کا باعث ہو گا جس سے ارتزاق ضروری ہے۔

تیسری بنیادی بات، جس پر مکمل یکسوئی کی ضرورت ہے، بیرونی طاقتوں سے تعلق اور ان پر انحصار سے متعلق ہے۔ آج کی دنیا میں ہر ملک کو دوستوں کی ضرورت ہے اور کوئی بھی مکمل تنہائی (isolation) کو لمبے عرصے تک برداشت نہیں کر سکتا۔ پاکستان بھی سب سے دوستی چاہتا ہے لیکن یہ دوستی پاکستان کی سلامتی اور اس کے بنیادی مفادات کے تحفظ کے فریم ورک میں ہی ہو سکتی ہے۔ بد قسمتی سے پاکستان کی خارجہ پالیسی ایک مدت سے امریکہ اور اس کے مفادات کی رینال (hostage) بن چکی ہے اور معاشی پالیسی بھی ایسے خطوط پر چلائی گئی کہ امریکہ کی گرفت معیشت اور خارجہ پالیسی دونوں پر سخت ہوتی چلی گئی۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس سلسلے میں بھی بنیادی فیصلہ کر لیا جائے۔ مقصد کسی ملک سے بھی نکلنا یا تناؤ (tension) کی فضا قائم رکھنا نہیں۔ لیکن ضروری ہے کہ اپنی سیاسی، معاشی اور تہذیبی آزادی کے تحفظ کے لیے ہم ایسی خارجہ پالیسی تشکیل دیں جو ایک طرف معروضی حقائق پر مبنی ہو، تو دوسری طرف ہمارے قومی مقاصد اور مفادات کی محافظ اور امین ہو۔

پاکستان کے بارے میں امریکہ، دولت مشترکہ اور یورپی اقوام نے اس وقت جو منفی رویہ اس وقت اختیار کر رکھا ہے اس نے اہل پاکستان کو ایک تاریخی موقع فراہم کیا ہے۔ دوست اور غیر دوست کھل کر

سامنے آگئے ہیں۔ غلط فہمیوں اور خیالی مفروضوں سے دامن چھڑانے کا وقت آگیا ہے۔ پاکستان ایک ایسی قوت ہے اور اگر ہم اپنی معیشت کو بین الاقوامی گرفت سے آزاد کر لیتے ہیں تو ہمارے لیے خارجہ پالیسی کو آزاد انداز میں مرتب کرنے اور چلانے کے غیر معمولی امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ مسلمان عوام ہمارے سب سے سچے دوست ہیں اور جن ممالک میں حکومتیں بیرونی اثرات کے تحت ہیں، وہاں بھی مسلمان عوام پاکستان کے لیے محبت رکھتے ہیں۔ اگر ہماری خارجہ پالیسی میں عوام کی تائید کا حصول ایک اہم ہدف ہو تو وہاں کی حکومتیں بھی اس اندرونی دباؤ کو نظر انداز نہیں کر سکتیں۔ بد قسمتی سے جو ”بابو“ خارجہ پالیسی بنانے کے ذمہ دار رہے ہیں، وہ خارجہ سیاست سے اس انقلابی پہلو کا ادراک ہی نہیں کر سکتے۔ جنرل پرویز مشرف کے حالیہ دورہ ترکی میں یہ پہلو بہت کھل کر سامنے آیا۔ ترک عوام پاکستان کے ساتھ ہیں لیکن ہمارے پالیسی ساز وقتاً فوقتاً ایسی حماقت کرتے رہتے ہیں جو عوام کی توقعات پر پانی پھیر دیتی ہے۔ ٹرکش ڈیلی نیوز کے ۱۰ اور ۱۱ نومبر کے شماروں میں اس روزنامے کے نمائندے کی رپورٹ اور ادارے کا مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سفارت کار زمینی حقائق سے کتنے ناواقف اور مسلمان امت کے احساسات اور عزائم سے کتنے نا آشنا ہیں اور محض اپنی ناحقیقت پسندی کی وجہ سے کیسے کیسے زریں مواقع کو ضائع کر رہے ہیں۔ خارجہ پالیسی کی سمت بدلے بغیر ہم عالمی غلامی کے نئے جال سے نہیں نکل سکتے۔

امریکہ کے بارے میں بھی واضح سوچ (clear thinking) کی از حد ضرورت ہے۔ امریکہ کے عالمی مقاصد اور ہمارے قومی مقاصد اس وقت ہم آہنگ نہیں۔ ویسے وہ کبھی بھی ہم آہنگ نہ تھے اور امریکہ نے ہمیشہ اپنے مفاد کے لیے ہمیں استعمال کیا ہے۔ جب بھی آزمائش کی کوئی گھڑی آئی، اس نے پاکستان کے مفادات کو زک پہنچائی، لیکن اب تو بات اتنی واضح ہے کہ خارجہ تعلقات کی نئی بنیادوں کو استوار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

حال ہی میں جو امریکی دستاویزات شائع ہوئی ہیں، اور ان میں روسیاد خان کی مرتب کردہ کتاب The American Papers: Secret and Confidential, India Pakistan Bangla Desh Documents 1965-1973 (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۹) کا مطالعہ بہت چشم کشا ہے۔ اس میں ڈین رسک سے لے کر ولیم روجر تک ہر امریکی سیکرٹری آف اسٹیٹ نے، بھارت کو امریکہ کے مفاد میں سب سے اہم ملک قرار دیا ہے اور صاف کہا ہے کہ جب بھی ہمیں پاکستان اور بھارت میں کسی ایک کو ترجیح دینا پڑے تو وہ بھارت ہونا چاہیے۔ اور یہ وہ زمانہ ہے جب ہماری امریکہ سے خصوصی دوستی (special relationship) تھی، سرد جنگ کی وجہ سے ہم اس کے لیے ناگزیر تھے اور بھارت روس کا حلیف تھا! اب تو دنیا کے حالات بالکل بدل گئے ہیں اور امریکہ کی ترجیحات مزید واضح ہو گئی ہیں۔ بھارت کی متعصب ہندو حکومت (بی جے پی) لبرل اور جمہوری حلیف ہے اور پاکستان کو ایک بنیاد پرست اور تشدد کی

سرپرست حکومت قرار دینے کی باتیں ہو رہی ہیں، اور ہماری خارجہ پالیسی ہے کہ اس میں اب بھی امریکہ پر انحصار کے چنگل سے نکلنے پر غور بھی نہیں کیا جا رہا ہے۔

حالات بدل چکے ہیں اور بدلے ہوئے حالات میں ہمیں بھی حقیقت پسندی کی بنیاد پر نئی خارجہ پالیسی مرتب کرنا ہوگی۔ اس کی بنیاد خود انحصاری، ملت اسلامیہ کا اتحاد، علاقائی نظاموں کی مضبوطی، عوام کی بیداری اور ان کا تحریک (mobilization) پر ہونا چاہیے۔ معاشی میدان میں مغرب کی بالادستی پر مبنی عالم گیریت (globalisation) کے مقابلے میں، پاکستان اور امت مسلمہ کی اجتماعی خود انحصاری کو ترجیح دینا چاہیے۔ نئے خطوط پر خارجہ پالیسی کی تشکیل کے لیے یہ وقت غنیمت ہے۔ دیر ہو چکی ہے مگر مزید تاخیر بے حد خطرناک ہوگی۔ اس کے لیے گہرے سوچ بچار کی ضرورت ہے تاکہ نئے دروست کی تشکیل ممکن ہو سکے۔ یہاں بھی اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کے خیالات سے بڑی رہنمائی ملتی ہے۔ اقبالؒ نے کہا تھا:

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سر آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی
مغرب کے بارے میں اقبال کا ذہن کتنا صاف تھا:

پیر فغاں فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیف غم نہیں، مجھ کو تو خانہ سازوے

نیز

یہ زائرانِ حرم مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا، جو تجھ سے ناآشنا ہے ہیں
اقبال نے ہماری حالت زار کا کتنا صحیح نقشہ کھینچا ہے:

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من
اور معاشی محتاجی کے باب میں بھی اس کی تنبیہ کتنی صحیح تھی:

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اب ہم جس مقام تک پہنچ چکے ہیں اس کے بعد معاشی خود انحصاری اور آزاد خارجہ پالیسی کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ اس بارے میں حکومت اور قوم یکسو ہو اور جو قیمت بھی ادا کرنی پڑے، سوچ سمجھ کر بہ خوشی ادا کی جائے، پورے ایمان اور شعور کے ساتھ اپنی راہ خود طے کی جائے۔

حالات کا جائزہ جس پہلو سے بھی لیں، بات بالآخر معیشت کی حالت زار پر آ جاتی ہے۔ کچھ کوتاہ نظر معاشی تباہی کا ہوا دکھا کر مزید محکومی اور کاسہ گدائی کی گردش نو کا نسخہ تجویز کرتے ہیں۔ ہماری نگاہ میں یہ تباہی سے بچنے کا نہیں، خودکشی اور مکمل تباہی کا راستہ ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اس بات کو بھی نئی قیادت کے سامنے بالکل صاف الفاظ میں رکھ دیں کہ معاشی حکمت عملی کو یکسر تبدیل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

پہلے چند بنیادی حقائق ذہن میں تازہ کر لیں:

گذشتہ تیرہ سال سے بنیادی صنعتوں اور معاشی انفراسٹرکچر میں کوئی نمایاں اضافہ نہیں ہوا، بلکہ بیمار صنعتوں کی تعداد ہر سال بڑھ رہی ہے۔ سرکاری شعبے کا کردار سکر بھی رہا ہے اور خسارے کا بھی شکار ہے۔ زراعت نے معیشت کو سارا دے رکھا ہے مگر زراعت خود بحران کا شکار ہے اور اس وقت خوراک اور اشیائے خوردنی کے باب میں تقریباً ۲ ارب ڈالر سالانہ کی درآمدات کرنا پڑ رہی ہیں۔ تیل کے سلسلے میں اچھی پیش رفت کے بعد پھر رجعت قبضی شروع ہو گئی اور ایک تہائی ملکی ضرورت کے لیے خود کفالت حاصل کرنے کے بعد پھر ہم پیچھے رہ گئے ہیں اور اس وقت ایک ارب ڈالر سالانہ سے زیادہ کا تیل درآمد کیا جا رہا ہے۔ برآمدات بار بار کی تخفیف قدر کے باوجود بڑھ نہیں سکی ہیں اور اب تو چار سال سے تقریباً ۸ ارب ڈالر سالانہ پر آکر رک سی گئی ہیں جس کے نتیجے میں تجارتی خسارہ بڑھ رہا ہے۔ بیرونی قرضوں کا بار ہمالیہ صفت ہوتا جا رہا ہے اور تم یہ ہے کہ ایک مدت سے نئے قرض صرف اس ضرورت کے تحت لیے جا رہے ہیں کہ پرانے قرضوں کو ادا کر دیا جائے۔ بیرونی قرضے اس وقت ۳۲ ارب ڈالر سے متجاوز ہیں اور اگر متوقع قرضوں اور دوسری ذمہ داریوں (liabilities) کو شامل کیا جائے تو یہ بوجھ ۴۲ ارب ڈالر تک پہنچ جاتا ہے۔ اس سال صرف بیرونی اور ملکی قرضے واپس کرنے کی ادائیگی کی مدتیں جو رقم صرف کی جا رہی ہے وہ ۳۰۰ ارب روپے سے متجاوز ہے، جو مرکزی آمدنی کے ۶۰ فی صد کے قریب ہے۔ اگر دفاع کے اخراجات کو جو اس خرچ کا نصف ہیں، شامل کر لیا جائے تو کل آمدنی کا ۹۰ فی صد صرف سود کی نذر اور دفاع پر صرف ہو جاتا ہے۔ پھر انتظامی اخراجات اور ترقیاتی منصوبوں کے لیے وسائل باقی ہی کہاں رہتے ہیں جو ملکی ترقی کی گاڑی آگے بڑھے! اس پر مستزاد کرپشن، کمیشن اور قرض ناپہندگی ہے۔ جو تھوڑی بہت رقم تعلیم اور سماجی ترقی کی مد میں خرچ کرنے کے لیے رکھی جاتی ہے، اس کا بھی ایک بڑا حصہ نااہلی، اقربا پروری اور غیر ذمہ داری کی نذر ہو جاتا ہے اور عوام اس کے فائدوں سے محروم ہی رہ جاتے ہیں۔

ان حالات میں اگر کچھ نئے قرضے لے بھی آئیں یا چند سرمایہ کاروں کو غیر معمولی سولتیں دیں (جیسا

کہ IPP یا ڈائیو کے سلسلے میں کیا گیا) تو کیا حاصل ہو گا؟

صاف نظر آتا ہے کہ جو کچھ اب تک ہوتا رہا ہے، اس کا کسی نئی شکل میں جاری رہنا ہمارے مسائل کا

حل نہیں۔ اسی عطار کی دوا (more of the same) کی اب کوئی گنجائش نہیں۔ بنیادی تبدیلی کے بغیر اس گرداب سے نہیں نکلا جاسکتا۔۔۔ پھر راستہ کیا ہو؟

۱۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان کی معیشت کا اس وقت تقریباً ۴۰ فی صد غیر رسمی معیشت (informal economy) کی صورت میں ہے جس کا شمار بڑی حد تک قومی پیداوار میں ہوتا ہی نہیں۔ یہ غیر رسمی معیشت ہماری دولت اور قیمتی اثاثے ہیں، ان کی وجہ سے ملک مکمل تباہی سے بچ گیا ہے اور عوام فقروفاقت کا شکار نہیں ہوئے۔ یہ ہماری قوت کا سرچشمہ ہے۔ اسے دستاویز بندی (documentation) کے نام پر تباہ نہ کیا جائے بلکہ سوچا جائے کہ اسے کیونکر مستحکم کیا جاسکتا ہے۔ حکومت کا کام محض ٹیکس وصول کرنا نہیں، ملک میں معاشی سرگرمی کو فروغ دینا ہے جس سے روزگار پیدا ہو، ضرورت کی اشیاء اور خدمات کی پیداوار اور فراہمی ہو، اور عوام اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ صنعتی سیکڑ میں بھی، بڑی صنعت کی پیداوار کی شرح میں اضافہ گذشتہ ۱۵ سال سے چھوٹی صنعت کی پیداوار کی شرح اضافہ سے نصف یا اس سے بھی کم رہا ہے۔ لطف یہ ہے کہ چھوٹی صنعت کی پیداوار کی شرح جاننے کا کوئی سائنسی طریقہ نہیں، اسے بڑی حد تک فرض (assume) کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ چھوٹی صنعت ہی نے ملکی معیشت کو زندہ رکھا ہوا ہے اور اگر اسے صحیح محرکات فراہم کیے جائیں تو ملک نہ صرف خود کفالت بلکہ برآمدات میں اضافے کی طرف بڑھ سکتا ہے۔ بھارت میں اس وقت اس کی کل برآمدات میں چھوٹی صنعت کا حصہ تقریباً ۲۰ فی صد ہے جب کہ ہمارے یہاں یہ دو چار فی صد سے زیادہ نہیں۔ چھوٹی صنعت اور غیر رسمی معیشت کی ترقی ایک اہم ترجیح ہونی چاہیے۔

۲۔ زراعت مسلسل غفلت کا شکار رہی ہے۔ جاگیرداری اور بڑی زمین داری آج بھی مسلط ہے اور تقریباً ۶ ہزار خاندان کل زیر کاشت رقبہ کے ۴۰ فی صد پر قابض ہیں۔ زرعی inputs کے باب میں دوبارہ حصول (retrieval) کی کوئی پالیسی نہیں۔ زرعی بیج کی قیمت اس شے کی زرعی پیداوار سے ۳ گنا زیادہ ہے۔ پانی کی فراہمی کا نظام درہم برہم ہے۔ بھارت میں پنجاب اور ہریانہ کی زمینوں سے فی ایکڑ پیداوار ہمارے پنجاب اور سندھ کی پیداوار سے ۳ گنا زیادہ ہے۔ زمین اور کاشت کار کی محنت میں فرق نہیں، لیکن پالیسی، سمولتوں اور محرکات کے فرق نے اتنا فرق کر دیا ہے۔ ہم زراعت میں ۲، ۳ سال میں خود کفیل ہو سکتے ہیں لیکن آج ہماری کل درآمدات کا ۲۰ فی صد زرعی اجناس پر مشتمل ہے۔ ایک طرف عام کاشت کار ہے جس کو اپنے اخراجات پورے کرنا مشکل ہو گیا ہے اور دوسری طرف ایک مخصوص طبقہ ہے جو نہ صرف عیش و عشرت میں مگن ہے بلکہ ظلم اور ناانصافی کے نظام کا پشتی بان بھی ہے۔ بنیادی زرعی اصلاحات اور نئی زرعی پالیسی حالات کو چند سال میں بدل سکتے ہیں۔

۳۔ قرضوں کا بوجھ اس مقام پر پہنچ گیا ہے جہاں ان کی واپسی ناممکن ہوتی جا رہی ہے۔ اس بارے

میں انفرادی اور اجتماعی سیاسی جدوجہد کی ضرورت ہے۔ قرضوں کی ادائیگی پر مملت moratorium اور ۵ سال کے بعد ادائیگی کے نئے شیڈول کی تیاری ہی معقول راستہ ہو سکتے ہیں۔ دنیا کے متعدد ممالک نے یہ راستہ اختیار کیا ہے۔ جنوبی امریکہ کے تیرہ ممالک نے کل درباؤ ڈالا اور قرضوں کی نئی شیڈولنگ کرائی۔ ورلڈ بینک کے ایک حالیہ جائزے کی روشنی میں ورلڈ بینک، آئی ایم ایف، آئی ایف سی، علاقائی بینکوں اور دوسرے اداروں سے ۱۳۲ بار ری شیڈولنگ کی جا چکی ہے۔ پاکستان کو اس سلسلے میں ایک بڑا فیصلہ کرنا ہو گا۔

ہماری معیشت کا باہر کی دنیا پر انحصار محدود ہے۔ کل درآمدات اور برآمدات مل کر قومی دولت کا ۱۵ فی صد بنتے ہیں۔ درآمدات میں صرف چار چیزوں پر خطیر رقوم صرف ہو رہی ہیں یعنی ایشیے خوردنی اور خوردنی تیل (تقریباً ۲ ارب ڈالر سالانہ)، تیل اور پٹرولیم مصنوعات (۱ ارب ڈالر سالانہ) اور تقریباً یہی ۳ ارب ڈالر ہمارا تجارتی خسارہ ہے۔ اگر ہماری درآمدات اور برآمدات برابر ہو جائیں تو ہم جتنا زرمبادلہ کمائیں گے اتنا ہی خرچ کرنے لگیں گے اور اس طرح بیرونی وسائل پر انحصار ختم کیا جاسکے گا۔

۴۔ ملکی معیشت کا اصل مسئلہ مزید قرضے حاصل کرنا نہیں بلکہ ملک میں پیداوار بڑھانا اور پیداواری (productivity) میں اضافے کا حصول ہے۔ معاشی ڈھانچے کو از سر نو مضبوط کرنا اور ترقی دینا ہے۔ اس کے لیے سب سے پہلے خود اپنے عوام کا، اپنے تاجروں، کاشت کاروں، صنعت کاروں کا اعتماد بحال کرنے اور انھیں پیداواری عمل میں مصروف کرنے کی ضرورت ہے۔ ملکی معیشت اور عالمی رجحانات کے مطالعے کے بعد راقم اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ محض اندھنی نچ کاری مسائل کا حل نہیں۔ ملک میں بینک کاری کا نظام بحران میں مبتلا ہے اور اسٹاک ایکسچینج کی بنیاد اتنی مختصر ہے کہ اس کی روشنی میں محض نچ کاری کی گردان کرنے سے مسائل حل نہیں ہوں گے بلکہ خطرہ ہے کہ ملک کی معیشت بیرونی سرمایہ کاروں اور قمار بازوں کے ہاتھوں میں چلی جائے گی۔ آنکھیں بند کر کے سرکاری شعبے کو نجی شعبے میں بدلنا زیادہ مفید نہیں ہو گا۔ سرکاری شعبے کا ایک کردار ہے اور اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اس کے کام کرنے کے انداز کو بدلنا ہو گا۔ اس کی تشکیل نو (restructuring) کی ضرورت ہے۔ اس میں نئی انتظامیہ (management) teams لانے اور بیرونی دنیا کے مختلف تجربات کو سامنے رکھ کر اداراتی اصلاحات کا راستہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ مناسب تحفظات کے ساتھ سرکاری شعبے معاشی ترقی کے لیے نیا محرک بن سکتا ہے اور اسے ایک خاص حکمت کے ساتھ اندرونی مسابقت اور بیرونی مسابقت دونوں کے لیے کھولا جاسکتا ہے۔ ایک بڑے ادارے کو کئی اداروں میں تقسیم کر کے اندرونی مسابقت کا اہتمام کیا جاسکتا ہے۔ واپڈا اور کے ای ایس سی کا انضمام کوئی اچھی حکمت عملی نہیں۔ خود واپڈا کے علاقے اور کام (function) کی بنیادوں پر تنظیم نو کی جا سکتی ہے اور اسے زیادہ مستعد اور فعال بنایا جاسکتا ہے۔ نجی شعبے اور سرکاری شعبے دونوں کو معاشی ترقی کے

لیے متحرک اور منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ نچ کاری کے کام پر ہم کم از کم ۱۲ سال ضائع کر چکے ہیں۔ نہ نچ کاری ہوئی اور نہ سرکاری شعبے کو کسی دوسری بنیاد پر ازسرنو منظم کرنے کی کوئی سعی ہو سکی۔ اس ٹخمے سے نکلنا بہت ضروری ہے۔

۵۔ بنک کاری کی اصلاح، مرکزی بنک کا احتساب اور نیا کردار اور چھوٹے کاشت کار، تاجر اور صنعت کار کے لیے چھوٹے قرضوں کی فراہمی کا متبادل نظام بھی وقت کی ضرورت ہے۔ سود کی لعنت سے نجات اور متبادل بنیادوں میں مالیاتی نظام کی تشکیل سے بھی بڑا فرق واقع ہو سکتا ہے اور بالکل ایک نیا باب شروع ہو سکتا ہے بشرطیکہ یہ کام پوری دیانت، محنت اور عوام کے تعاون سے انجام دیا جائے۔

۶۔ کرپشن کا سدباب اور لوٹی ہوئی دولت کی واپسی بھی اس حکمت عملی کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس سلسلے میں ہم پہلے بھی اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔ میری نگاہ میں اگر کرپشن کا موثر سدباب ہو جائے تو موجودہ سرکاری آمدنی میں ۲۵ سے ۵۰ فی صد اضافہ ممکن ہے۔ اصل ضرورت نئے ٹیکس لگانے کی نہیں بلکہ ٹیکس صحیح طور پر وصول کرنے اور ٹیکس کی ادائیگی کی فضا بنانے کی ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ ٹیکس دینے والوں کو فیصلہ سازی میں شریک کیا جائے اور ٹیکس آمدنی کو ایسے شفاف انداز میں خرچ کیا جائے کہ ٹیکس دینے والے اور عوام اس کے مثبت اثرات کو دیکھ سکیں۔ ٹیکس کا ایک بنیادی اصول عوام کی مرضی ہے: رضامندی کے بغیر کوئی ٹیکس نہیں (no taxation without consent)۔ اسی لیے جمہوریت میں ٹیکس لگانے کا حق صرف منتخب نمائندوں کو ہوتا ہے جس کا مقصد ٹیکس دینے والوں کا، مرضی اور اعانت ہے۔ ہمارے یہاں یہ رشتہ بالکل ختم ہو چکا ہے، اسے بحال کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ٹیکس کے نظام کو بدعنوانیوں سے پاک کیا جاسکے تو کوئی وجہ نہیں کہ کم شرح کے باوجود زیادہ آمدنی کا حصول ممکن نہ ہو۔ استعماری دور کے رسم و رواج سے نجات اور ایک نئے ٹیکس کلچر کی ضرورت ہے تاکہ ٹیکس گزاروں کی بنیاد وسیع ہو سکے۔ شرح ٹیکس معقول ہو، سرکاری اخراجات جائز طریقے سے اور عوام کی بہبود کے لیے ہو اور یہ سب کچھ چشم سر سے نظر آسکے۔ پھر دیکھیے لوگوں کا رویہ کس طرح بدلتا ہے۔

۷۔ عالمی معاشی اثر اندازیوں سے تحفظ کے لیے ضروری ہے کہ علاقائی سطح پر معاشی منصوبہ بندی اور تنظیم کاری کی فکر کی جائے۔ پاکستان کی بڑی سترے بیجک اہمیت ہے۔ ایران، افغانستان اور پاکستان کے درمیان بڑی معاشی مناسبتیں (complementalities) ہیں۔ وسط ایشیا اور غربی ایشیا سے معاشی تعاون کا بڑا امکان ہے۔ چین اور پاکستان کے درمیان معاشی تعاون کے لیے وہ کوششیں نہیں ہوئیں جو سیاسی اور عسکری تعاون میں ہوئی ہیں۔ عالمی معاشی حالات جس رخ پر جا رہے ہیں ان تمام ممالک کے لیے ناگزیر ہو جائے گا کہ علاقائی تعاون کے ذریعے مغربی سرمایہ داری اور معاشی استعماری یلغار کو روکیں اور اپنی حفاظت کریں۔ اس کے لیے جتنی جلدی اور مستعدی سے منصوبہ بندی اور گفت و شنید کا آغاز کیا جائے اتنا

ہی مفید ہو گا۔

یہ وہ چند خطوط ہیں جن پر ایک متبادل معاشی حکمت عملی استوار کی جاسکتی ہے اور یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر موجودہ دلدل سے نکلنا ممکن ہو سکے گا۔ جو چیزیں دلدل میں لے گئی ہیں، انہی کو اختیار کرنے کے معنی تو یہ ہیں کہ ہم اسی دلدل میں مزید دھنستے چلے جائیں۔ یہ زندگی اور ترقی کا نہیں، تباہی کا راستہ ہو گا۔

یہ سارا کام غلامانہ ذہن کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ یہ کام صرف ٹیکنو کریٹس بھی نہیں کر سکتے۔ پالیسی سازی کے لیے ٹیکنو کریٹس کا تعاون اور تجربہ بہت ضروری ہے لیکن جس طرح چلنے کے لیے دو ٹانگیں درکار ہیں اسی طرح پالیسی سازی کے لیے فنی مہارت اور تجربے کے ساتھ عوام سے ربط، ان کے مزاج، حالات، کوائف، رجحانات، احساسات، تئناؤں، خدشات اور تحفظات کا علم بھی ضروری ہے۔ پالیسی نہ خلا میں بنتی ہے اور نہ خلا میں نافذ کی جاتی ہے۔ عوام سے باہمی تعامل (inter action) کے بغیر پالیسی سازی ایک رنجی اور غیر حقیقت پسندانہ رہتی ہے اور یہی ہماری خرابی رہی ہے۔ حکومت کے وہ دور جن کو جمہوری کہا جاتا ہے ان میں بھی قیادت کا عوام سے ربط و تعلق اور عوام کے رد عمل کا لحاظ (feed back) نہ ہونے کے برابر تھا۔ فوجی حکومت میں یہ خطرہ مزید بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے صرف پریس اور میڈیا کی آزادی کافی نہیں ہے، عوامی شرکت بھی ضروری ہے۔ اس کے لیے طاقت کی منتقلی (devolution of power) بھی ضروری ہے۔ ہر سطح پر پالیسی سازی میں ان لوگوں کی شرکت بھی ضروری ہے جو عوام میں سے ہوں، عوام میں اٹھتے بیٹھتے ہوں، اور پالیسیوں کے عوامی اثرات کو جان سکتے ہوں اور ان کی روشنی میں پالیسی سازی پر اثر انداز ہو سکتے ہوں۔ دستور میں جتنی صوبائی مختاری اور اختیارات کی تقسیم موجود ہے اس کے ۸۰ فی صد پر عمل نہیں ہوا۔ اگر اس پر عمل ہو تو مرکز میں کم از کم ۱۳ وزارتیں ایسی ہیں جن کا کوئی جواز نہیں۔ پھر جب تک نیکس لگانے اور نیکس سے حاصل ہونے والی آمدنی صرف کرنے اور اس کی جواب دہی کرنے کا عمل صوبائی اور مقامی سطح پر نہیں پہنچتا، تقسیم اختیارات بے معنی ہوگی۔

چند بنیادی اصلاحات کی فوری ضرورت ہے: ایک طرف دستوری ڈھانچے کو فی الحال بدلے بغیر مرکز، صوبے اور ضلع کی سطح پر ایسے موثر نظام کا قیام جو اپنے اپنے دائرے میں سیاسی فیصلہ کرنے، نیکس لگانے، ترقیاتی پروگرام اور سماجی خدمات بڑی حد تک خود انحصاری اور خود مختاری کے انداز میں رو بہ عمل آسکیں۔ ضلع کی سطح پر ایسا منتخب نظام ہونا چاہیے جس میں ضلع کا سربراہ (ناظم / ڈپٹی گورنر) منتخب ہو اور ہر دو سال بعد دوبارہ انتخاب ہو۔ انتظامیہ اس کے اور اس کی منتخب کونسل کے ماتحت ہو اور نظم و نسق، ترقیات، تعلیم،

صحت، ٹرانسپورٹ کا نظام اس سطح پر مناسب اداروں (authorities) کے ذریعے کام کرے۔ اس سطح پر نیکس کا اختیار بھی دیا جائے۔ یہ سارا کام مناسب قانون سازی کے ذریعے کسی دستوری ترمیم کے بغیر ہو سکتا ہے۔ اس کے اوپر صوبے کا نظام ہو اور مرکز ان کاموں تک اپنے آپ کو محدود رکھے جو دستور میں اسے دیے گئے ہیں۔ اس اداراتی (institutional) اور بینتی (structural) تبدیلی کے ساتھ مرکز، صوبہ اور ضلع ہر سطح پر عوامی شرکت کا اہتمام ہو۔۔۔ فوری طور پر عوام ہی سے نیکوکار، اچھی شہرت والے لوگوں کو پالیسی سازی میں شریک کیا جائے اور بالآخر انتخابی نظام کی ہر سطح پر بحالی کے ذریعے نیکو کریش اور عوامی نمائندوں کے باہمی اشتراک ہی سے کوئی اچھا نظام چل سکتا ہے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ جو نظام بھی ہو وہ شفاف ہو، کھلے انداز میں حکمرانی کی ذمہ داریاں خدمت کے جذبے سے انجام دی جائیں۔ جو اب دہی کا نظام موجود ہو، محنت کا پورا پورا حق ادا کیا جائے لیکن کرپشن کا ہر دروازہ اور دریچہ بند کر دیا جائے۔ یہ سارا کام قانون اور جبر کے ذریعے نہیں بلکہ عوام کی مرضی اور مادی محرکات کے ساتھ ساتھ اخلاقی، دینی اور قومی جذبات کو بھرپور انداز میں انگیز کر کے انجام دیے جائیں۔ حالات خواہ کتنے بھی خراب ہوں، نہ ہم اللہ سے ناامید ہیں اور نہ اپنی قوم سے۔

آپ قوم کے اچھے جذبات و احساسات کو انگیز کریں اور دیکھیں کہ یہ قوم کس طرح زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہو جاتی ہے۔ آپ اس زبان میں بات کریں جو یہ قوم سمجھتی ہے، ان محرکات کو موثر بنائیں جن سے اس کی تاریخی روایات وابستہ ہیں، اسے یہ ایہ دلائل کہ اس کے دن بدل جائیں گے اور اس کی امتگیں اور آرزوئیں پوری ہو سکیں گی، اسے سواری کے لیے استعمال نہیں کیا جائے گا بلکہ وہ خود شہ سواری کر سکے گی تو آپ انھی عوام کو ایک نئے رنگ میں دیکھیں گے اور نئی رفعتوں کی طرف پیش قدمی کر سکیں گے۔

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی